بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کے قارئین اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ ہم نے اپنے قلم سے کبھی سنسنی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ نہایت سنگین قسم کے حالات میں بھی قوم کو مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہونے سے بچایا ہے اور اسے شعاعِ امید دکھانے کی سعی کی ہے۔ مگر ہم اسے دیانت کے خلاف سمجھتے ہیں کہ اہل وطن سے ملک کی صحیح صورت حال کو چھپایا جائے اور اب جب کہ ملک انتہائی نازک اور پریشان کن مراحل سے گزر رہا ہے تو انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا رکھا جائے کہ پاکستان بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ اس قسم کی خوش فہمی پیدا کرنا قوم کی کوئی خدمت نہیں بلکہ اس کے ساتھ شرمناک قسم کی دھوکہ بازی ہے۔ جب گھر کے اندر اور باہر آگ لگی ہو اور گھر کے مکینوں کی بیشتر تعداد اس سے غافل ہو تو جو لوگ اس تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں ان کا جہاں یہ فرض ہے کہ وہ اپنی حد تک آگ بجھانے کی کوشش کریں وہاں ان پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ بے خبر اور نیند کے ماتے انسانوں کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کریں تاکہ وہ کہیں خوابِ غفلت میں نہ مارے جائیں اور اگر وہ اس آگ پر قابو پانے کے لیے کچھ کرنے کی طاقت رکھتے ہوں تو کر گزریں۔ اسی احساس کے تحت ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں۔

ہم اپنے اہل وطن کو یہ تلخ حقیقت بلا کم و کاست بتا دینا چاہتے ہیں کہ جو ملکی اور غیر ملکی طاقتیں مشرقی پاکستان کی بربادی کا باعث بنی ہیں وہی طاقتیں آج مغربی پاکستان کو تباہ کرنے میں پوری طرح منہمک اور سرگرم عمل ہیں اور ان کے انہماک اور سرگرمیوں کے نتائج سے کوئی ایسا شخص غافل نہیں جو حالات کی معمولی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے۔ تباہی کا عمل ہر میدان میں شروع ہو چکا ہے اور اگر اسے غیر معمولی تدبیر، حکمت و دانائی، اخلاص اور قوت سے نہ روکا گیا تو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ کہیں ملک کے اس حصے کا

بھی وہی حشر نہ ہو جو مشرقی پاکستان کا ہوا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ مگر حالات جس رخ جا رہے ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے انسان دہشت زدہ ضرور ہو جاتا ہے۔

جس طرح کسی شخص کے بیمار ہونے سے پہلے ہی اس کے جسم پر بیماری کی علامتیں نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور مرض کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان علامتوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے بالکل اسی طرح قوموں کی زندگی میں بھی بعض علامتیں ایسی ابھرتی ہیں جو ان کی صحت کا پتہ دیتی ہیں اور بعض علامتوں سے ان کے تنزل اور بربادی کا نشان ملتا ہے۔ کسی قوم کے لیے خطرے کا سب سے بڑا الارم یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے مقصد وجود کی بھی خبر نہ رہے اور اس کے ذمہ دار افراد دیوانوں کی طرح اپنی زبان سے اناپ شناپ کہتے رہیں۔۔ اور قوم کو کسی تعمیری اور با مقصد کام پر لگانے کے بجائے اسے میلوں ٹھیلوں میں مصروف رکھیں، اور اگر اس سے کوئی کام بھی لیں تو وہ سراسر تخریبی نوعیت کا ہو۔ جب کوئی فرد اپنی زندگی کا مقصد کھو دیتا ہے تو اس کا وجود کارزار حیات میں بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی زندگی اور حیوان کی زندگی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس بے مقصد انسان کی زندگی گو انسانی نقطۂ نظر سے عبث اور بیکار ہوتی ہے مگر اس کا چراغِ حیات گل نہیں ہونے پاتا۔ وہ اس دنیا سے اسی وقت رخصت ہوتا ہے جب قدرت کی طرف سے اس کے سانس پورے ہو چکے ہوں۔ وہ خواہ دیوانوں کی طرح زندہ رہے یا حیوانوں کی طرح لیکن ایک معینہ مدت تک زندہ ضرور رہتا ہے۔ قوموں کی زندگی کا معاملہ افراد کی زندگی سے بہرحال بالکل مختلف ہوتا ہے۔ قوموں کی زندگی مقصد کی محبت سے عبارت ہوتی ہے۔ مقصد کی لگن ہی کسی قوم کی حیات ہے اور مقصد سے بُعد اور دوری موت۔ جب تک کوئی قوم کسی مقصد کی محبت میں سرشار رہتی ہے اور اس کی خاطر وہ ہر قسم کی قربانی دینے پر آمادہ ہوتی ہے اس وقت تک اس کی زندگی کو نہ صرف یہ کہ کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا بلکہ وہ قوت اور طاقت اور عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔ اس کی صفوں میں کامل اتحاد اور اس کے افراد میں اپنی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کا شدید جذبہ کارفرما رہتا ہے۔

با مقصد قوم جو قدم بھی اٹھاتی ہے سوچ سمجھ کر اٹھاتی ہے اور جو کچھ بھی کرتی ہے پورے اعتماد اور اِس احساس ذمہ داری کے ساتھ کرتی ہے کہ اس کا یہ عمل اسے اپنے مقصد کے قریب تر لا رہا ہے۔

اُس کے لیے اس بات کا تصور بھی ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنی قوتوں اور اوقات کو ایسے فضول کاموں میں صرف کرے جن سے اس کی منزل کھوٹی ہونے کا کوئی معمولی خطرہ بھی ہو۔ مقصد کا عشق نہ صرف اس کے اندر ترتیب و تنظیم پیدا کرتا ہے بلکہ اسے راستے کی دشواریوں سے بے نیاز کرکے رواں دواں منزلِ مقصود کی طرف لے جاتا ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کے اس بنیادی اصول کی روشنی میں جب ہم اپنی قوم کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھ کر دل بیٹھنے لگتا ہے کہ ہماری قوم کا نصب العین سے رشتہ اتنا کمزور پڑتا جا رہا ہے جتنا کہ کسی دم اکھڑتے مریض کا سانس سے ہوتا ہے۔ اسلامی نظامِ حیات کے احیاء کے بلند نصب العین نے اِس قوم کو ناقابلِ بیان مصائب اور شدائد کے باوجود زندہ رکھا، اُسے ہر عہد میں تازہ ولولہ بخشا، اس کے اندر باطل قوتوں سے ٹکرانے کی ہمت پیدا کی۔ آپ اس نیم برّاعظم کی گزشتہ ہزار سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آئے گی کہ مسلم قوم کی زندگی اور اس کے حفظ و بقا کا سارا دارومدار اسلام اور صرف اسلام پر رہا ہے۔ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا سہارا ایسا نظر نہیں آتا جس سے اُس نے ماضی میں قوت و توانائی حاصل کی ہو یا آئندہ حاصل کرنے کا بعید امکان بھی ہو۔ مسلمانوں نے اس نیم برّاعظم میں مختلف میدانوں میں جو جدوجہد کی ہے اس کے پس پردہ بھی یہی ایک جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ ان کی اجتماعی زندگی اس مثالی نقشے کے مطابق مرتب ہونی چاہیے جو انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جلیل القدر صحابہ سے ملا ہے۔ یہی جذبہ مسلمانوں کی ساری قومی تحریکوں میں خواہ وہ شاہ اسماعیل شہید کی تحریک آزادی ہو یا تحریک خلافت صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اور تو اور خود تحریک پاکستان بھی اسی جذبے کا عملی اظہار ہے۔ اور اسی وجہ سے اس تحریک میں اُن مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا جو اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے کہ انہیں پاکستان کے اندر رہنے کا کبھی موقع نہ ملے گا اور پاکستان کے مادی وسائل سے وہ قطعاً کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

قومیں بلاشبہ اپنے نظریات اور مقاصد تبدیل کرتی رہتی ہیں مگر اس تبدیلی کی ٹھوس وجوہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک قوم پہلے ایک نظریے کی علمبردار بن کر جدوجہد کرتی ہے مگر جب اُس نظریے کے عملی

نتائج سامنے آتے ہیں اور اس پر یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ یہی نظریہ اُس کی تباہی کا موجب بنا ہے تو وہ فوراً اس نظریے سے تائب ہو کر کوئی دوسرا نظریہ اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی مثال ہمیں نازیوں کے دلپسند آریائی نسلی تفوق کے نظریے میں ملتی ہے۔ پہلے تو اہلِ جرمن نے اس نظریے کو پورے جوش و خروش سے اپنایا مگر جب اس نظریے کی تباہ کاریاں اُن کے سامنے آئیں تو پھر اس کے بارے میں اُن کے اندر سرد مہری کے احساسات پیدا ہوئے اور انہوں نے اُسے ترک کر دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

کسی نظریے کو تیاگ دینے کی دوسری وجہ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ وہ نظریۂ حیات قوم کے بہت سے فکری اور عملی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتا ہے اور قوم کے اندر یہ احساس اُبھرنے لگتا ہے کہ یہ اُس کے لیے پیرِ تسمہ پا بنا ہوا ہے اس لیے جب تک اس سے نجات حاصل نہیں کی جاتی وہ دنیا میں کوئی قابلِ قدر ترقی نہیں کر سکتی۔ اس کی مثال ہمیں اہلِ مغرب اور مسیحیت کے باہمی تعلق سے ملتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد جب دنیائے مغرب کے اندر ذہنی اور فکری بیداری پیدا ہوئی تو مسیحی تعلیمات کا ناقدانہ جائزہ لیا جانے لگا اور اس حقیقت کا کھوج لگانے کی کوششیں شروع ہوئیں کہ یہ مذہب اہلِ مغرب کے نئے تقاضوں کو کہاں تک بطریق احسن پورا کر سکتا ہے۔ اس جائزے کے بعد جب یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ مسیحیت اجتماعی معاملات میں انسان کی رہنمائی نہیں کر سکتی، تو اس مذہب کو زندگی کے شخصی دائرے تک محدود کر دیا گیا اور اجتماعی معاملات کو مذہب کے اثر سے یکسر آزاد رہ کر حل کرنے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔

کسی نظریے کو ترک کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ نظریہ ایسی خرافات اور مضحکہ خیز تعلیمات سے عبارت ہوتا ہے کہ کوئی قوم اُسے دیر تک اپنے سینے سے لگائے رہنے کی ہمت اور جرأت نہیں کرتی۔ پھر ان خرافات کی وجہ سے اس قوم کی تاریخ اتنی سیاہ ہوتی ہے کہ نئی نسلیں اپنے ماضی پر فخر کرنے کے بجائے شرم محسوس کرتی ہیں۔ اُن کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح اُن کا اس تاریک ماضی سے رشتہ منقطع ہو جائے۔ اس لیے وہ نہ صرف ماضی سے اپنے تعلق کو ختم کر دیتی ہیں بلکہ تاریک خیالی کے اس نظریے سے بھی دامن کش ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے اُن کا ماضی سیاہ ہوا ہے۔

ان تینوں وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ بھی ایسی نہیں جو مسلم قوم کے لیے ترک اسلام کی ترغیب کا باعث بن سکے۔ اسلام ایک ایسا مکمل متوازن اور ہمہ گیر نظریہ حیات ہے جس کے صحیح اور برحق ہونے پر پوری انسانی تاریخ شہادت پیش کرتی ہے۔ پھر یہ کوئی ایسا نظریہ نہیں جو صرف کتابوں کے صفحات کی زینت ہو بلکہ اس نے زندگی کے ہر دائرے میں ایسے تابناک نقوش چھوڑے ہیں جن کی روشنی سے آج بھی انسانیت ہر گام پر ہدایت اور رہنمائی حاصل کر رہی ہے۔ انسانیت دین فطرت سے جس قدر انحراف کرتی ہے اسی قدر تھپیڑے کھا کر دوبارہ اس کی طرف لوٹنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ہم یہاں اس کی دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اسلام نے انسان کی اصلاح کا جو پروگرام پیش کیا ہے اس کا ایک نہایت اہم جزو یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان کے اندر جو انسان چھپا بیٹھا ہے اس کی اصلاح کی طرف توجہ دی جائے کیونکہ جب تک وہ داخلی طور پر اپنے آپ کو کسی ضابطے کا پابند نہیں کرتا ملکتی اور معاشرتی قوانین یا دوسرے لفظوں میں خارجی جکڑ بندیاں انسان کو کسی ضابطہ اخلاق کا پابند نہیں بنا سکتیں۔ دنیائے مغرب نے اس نظریے کو دقیانوسی قرار دیتے ہوئے رد کر دیا اور اپنے اس طرز عمل کے حق میں یہ دلیل پیش کی کہ اصلاح باطن کا دارومدار جن احساسات پر ہے یعنی خوف خدا اور فکر آخرت وہ انسان کے فکری نشوونما میں حارج ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان کے دل و دماغ کو اس قسم کے غیر صحت مندانہ احساسات سے پاک کیا جائے اور اسے صرف جبلی محرکات اور تلخ و شیریں تجربات کی روشنی میں پروان چڑھنے دیا جائے۔ اس نظریے کا خوب پرچار کیا گیا اور اہل یورپ نے اپنی نوخیز نسلوں کو خدا، آخرت، ضمیر، ایمان جیسے تصورات سے پوری طرح بچا کر پرورش کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کا نیا انسان بپھرے ہوئے حیوان کی صورت میں سامنے آیا اور مغرب کی انسانی برادری کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس انسان نما حیوان کو نظم و ضبط کا پابند بنانے کے لیے نہایت سخت قسم کے ضابطے وضع کرے۔ یہ فکری آزادی کی اس تحریک کا ثمرہ تھا جس نے اہل یورپ کو فاشزم، نازی ازم اور اشتمالیت جیسے غیر انسانی نظاموں کو بالجبر اپنے اوپر مسلط کرنے پر مجبور کر دیا۔ یورپ میں اس موضوع پر جو لٹریچر شائع ہو رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل یورپ کو اپنی اس غلطی کا شدید احساس ہوا ہے۔ غالباً گزشتہ برس ریڈرز ڈائجسٹ میں امریکہ کے سابق صدر آئزن ہاور کا اس موضوع پر ایک فکر انگیز مقالہ شائع ہوا جس میں اس غلطی کا واضح اعتراف موجود تھا۔

قریب قریب یہی حال اہل مغرب کے معاشی تجربات کا ہے۔ وہ کبھی آزاد معیشت کی پالیسی اختیار کرتے ہیں اور جب اس کی برائیاں کھل کر سامنے آتی ہیں تو ان کے تدارک کے لیے معاشی جکڑ بندیوں کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد جب اس کی ہولناکیوں کا پتہ چلتا ہے تو پھر آزاد معیشت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بدنصیبی کے یہ چکر اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ مغرب جس نظام حیات کا علمبردار ہے وہ توازن سے یکسر عاری ہے۔

مسلم قوم اگرچہ اس وقت ذہنی اور عملی انحطاط کا شکار ہے مگر اس انحطاط کے باوجود وہ فکری لحاظ سے اس قدر تہی دامن نہیں ہوئی کہ اسلامی نظام حیات کی غیر معمولی خوبیوں اور باطل نظاموں کی نمایاں خامیوں کو نہ سمجھ سکے خصوصاً جبکہ تجربات کی کسوٹی نے کھرے اور کھوٹے سکوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلامی نظام میں جو توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے اسے ہر مسلمان نہ صرف اچھی طرح جانتا ہے بلکہ اسے پوری طرح محسوس بھی کرتا ہے اور اسلام کے اس امتیازی وصف کے عملی مضمرات سے بھی وہ بخوبی واقف ہے۔

اس کے علاوہ ہر مسلمان اس حقیقت سے بھی پوری طرح آشنا ہے کہ اسلام خالق کائنات کا عطا کردہ نظام حیات ہونے کی وجہ سے ہر دور میں اور ہر قسم کے حالات میں انسان کی صحیح رہنمائی کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ کبھی کہنہ اور ازکار رفتہ نہیں ہوتا بلکہ ہر دور کے تقاضوں کو نہایت اچھے انداز میں پورا کر سکتا ہے۔ اس کے افکار و نظریات، اس کے اساسی تصورات، اس کے اخلاقی اور معاشرتی ضابطے اور معاشی اور سیاسی ڈھانچے سب اس کی تر و تازگی کی شہادت پیش کرتے ہیں۔

پھر اسلام کا ماضی اس قدر درخشاں اور تابناک ہے کہ مسلمانوں نے اسے دیکھ کر ہمیشہ فخر سے سر اونچا کیا ہے۔ وہ جب بھی اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتے ہیں انہیں کبھی بھی ندامت محسوس نہیں ہوئی بلکہ انہیں ہمیشہ اس امر کا احساس ہوا ہے کہ اُن کے دین نے انسانوں کو انسانیت سکھائی، تہذیب کے گیسو سنوارے، علم و فن کو بام عروج تک پہنچایا اور عقل کو چار چاند لگائے۔ دنیا میں آج علم و ہنر کی جو روشنی موجود ہے وہ سب مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اسلام کے بارے میں مسلمانوں کے ان احساسات اور جذبات کے ہوتے ہوئے کیا اس بات کا تصور

بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ دینِ حق کو چھوڑ کر کسی دوسرے دین کو اختیار کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں خصوصاً جب انہیں اس بات کا بھی پوری طرح شعور ہو کہ اسلام اُن کے لیے رگِ جاں کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسلام کے ساتھ مسلمانوں کے اس گہرے تعلق کے پس منظر میں جب ہم پاکستان میں غیر اسلامی نظریات کی یلغار اور اس معاملے میں اہل پاکستان کے کمزور دفاعی موقف اور خطرے کے صحیح احساس میں کمی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم پر سکتہ کا عالم طاری ہو جاتا ہے کیونکہ یہ علامتیں اس بات کی دہائی دے رہی ہیں کہ یہ ملک کسی تباہ کن طوفان کی لپیٹ میں آنے والا ہے جس کی مدافعت کے لیے نہ تو ہمارے پاس کوئی سازو سامان ہے نہ اس کی روک تھام کے لیے ہم نے کوئی موثر تیاری کر رکھی ہے اور نہ اس کی شدت کو ہماری قوم نے پوری طرح بھانپا ہے۔ طوفان کا آغاز ہمیشہ ہوا کے نرم جھونکوں اور خس و خاشاک کے اُڑنے سے ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس میں تندی پیدا ہونی شروع ہوتی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ پاکستان کس وقت سے اس طوفان کی زد میں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستان کے قیام سے پہلے جب محض اس کا تصور ہی ابھرا تھا تو اسلام دشمن طاقتیں اس کے خلاف طوفان اٹھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی تھیں کیونکہ مذہب کی بنیاد پر کسی الگ خطہ ارض کا قیام ان کے تصور قومیت کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ پہلے تو وہ اس کے قیام میں حائل ہوئیں اور جب اُن کی ساری کوششوں کے علی الرغم یہ معرض وجود میں آگیا تو پھر اس کے خلاف خوفناک قسم کی سازشیں شروع کر دیں۔ ان سازشوں میں بعض سازشیں تو بڑی کھلی اور واضح تھیں اور بعض پس پردہ مگر ان سب کا مقصد ایک ہی رہا ہے کہ کسی طرح اِس خطۂ پاک کو دنیا کے نقشے سے مٹا دیا جائے جو اسلام کے تصور قومیت کے نشان کی حیثیت سے ان کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہا ہے۔ اسلام دشمن طاقتوں کی سرگرمیاں یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں دیکھی جا سکتی ہیں مگر بعض شعبوں میں یہ بڑی نمایاں ہیں۔ مثلاً سیاست میں ان کے ذریعے مسلم قوم کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی کہ یہ ملک کسی ایک قوم کا ملک نہیں بلکہ پانچ مختلف قومیتوں کا ملک ہے۔ بنگالی، پنجابی، بلوچی، سندھی اور پٹھان اِس باطل خیال کو تقویت دینے کے لیے کبھی علاقائی زبانوں کی ترقی پر زور دیا جاتا اور کبھی علاقائی ثقافت کی ترویج و اشاعت کی اہمیت جتلائی جاتی ان ساری کاروائیوں کا ہدف بہر حال ایک ہی تھا کہ مذہب نے اس ملک کے باشندوں کے مابین اخوت کا جو رشتہ قائم کر کے (باقی صفحہ ۷۴ پر)

بداعمال قسم کے لوگوں سے مرعوب و متاثر نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی صفت یہ ہے کہ وہ بڑا زبردست اور انتہائی سخت گیر ہے۔ انسان کو بھی چاہیے کہ وہ کفار و مشرکین کے لیے بڑا شدید اور مفسدین کی راہ روکنے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ شکر کی قدر کرنے والے اور خطا کاروں کو معاف فرمانے والے ہیں انسان کا بھی کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ حسنِ سلوک کرنے والوں کا قدر داں ہو اور معذرت چاہنے والوں سے درگزر کرے۔ اللہ تعالےٰ کبھی راہِ راست سے انحراف نہیں فرماتے انسان کا بھی فرض ہے کہ وہ ہمیشہ جادۂ مستقیم پر گامزن رہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت شانِ کمال رکھتی ہے۔ اور وہ ذات ہر عیب سے پاک اور ہر نقص سے منزہ ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو نقائص اور عیوب سے پاک کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

اب فرمائیے کہ جس معاشرے کے افراد کے سامنے یہ اخلاقِ الٰہی ہوں کیا اُن کے اندر کوئی خرابی یا بگاڑ رہ نا ہو سکتا ہے۔ اور کیا ان کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو نورِ حق سے منور نہ ہو۔ اور نفوس و طبائع انسانی کے لیے اخلاق اللہ سے زیادہ موثر کوئی اور چیز بھی ہے جس کی تاثیر کی انہیں حاجت ہو اور جس کے لیے انہیں دائرۂ دین و ایمان سے باہر قدم رکھنا پڑے؟ ظاہر ہے کہ ایسی کسی چیز کا انفس و آفاق میں کہیں وجود نہیں۔

(بقیہ اشارات)

انہیں ایک قوم بنایا ہے وہ رشتہ مضمحل اور کمزور ہو جائے اور اس کی جگہ نسلی اور لسانی تعصبات کو سر اٹھانے کا موقع ملے اور اس طرح اس قوم کا شیرازہ بالکل منتشر ہو کر رہ جائے اور غیر ملکی طاقتیں ان چھوٹی چھوٹی قومیتوں کو بڑی آسانی سے ہڑپ کر سکیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے موقع پر اندرا گاندھی اور اس کے ہمنوا بہت سے دوسرے مغربی مفکرین اور سیاستدانوں نے جن خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا تھا وہ الفاظ کے تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ قریب قریب یہی تھے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دورِ جدید میں مذہب کی اساس پر کسی ملک کا قیام خیال خام ہے۔

پاکستان میں اسلام کے خلاف سازش کی دوسری کمین گاہ غیر اسلامی ادب اور ثقافت ہے۔ اشتراکی خیالات رکھنے والے ادبا نے عوام کے ذہنوں کے اندر انتشار پیدا کرنے اور انہیں دائرہ اسلام سے نکال کر مارکس اور لینن کا حلقہ بگوش بنانے کے لیے بڑی جدو جہد کی۔ شعائرِ اسلام کا مذاق اُڑایا، علماء کی

تضحیک کا سامان فراہم کیا اور اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں یہ تاثر پیدا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ یہ دین محض قصۂ پارینہ ہے اور اس کی تعلیمات ماضی کی داستانیں ہیں جنہیں رہوار زمانہ نے گرد کی طرح پیچھے پھینک دیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ نئے زمانے میں پرانی باتیں سنانے کا شغل فرما رہے ہیں وہ کوئی تاریخ ساز اور انسانیت کے خیر خواہ لوگ نہیں بلکہ احمق اور دشمن انسان ہیں کیونکہ انسانیت نے جن زنجیروں کو توڑ دیا ہے، اور جن جنگلوں کو خیرباد کہہ دیا ہے اُن کی طرف بلانے والوں کی آواز ہمیشہ وحشت اور دیوانگی کی آواز ہوتی ہے۔

فکری انتشار کے علاوہ ادیبوں کے اس گروہ نے نوجوان نسل کے اخلاق کو بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور یہ سارا کام انہوں نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر کیا کہ بگڑے ہوئے اخلاق کے لوگ ممکن ہے کسی دوسری تحریک یا کسی دوسرے نظام حیات کے لیے کار آمد ثابت ہوں مگر اسلام کے لیے بالکل بیکار ہوتے ہیں اس لیے اگر نوجوانوں کے اخلاق تباہ کرنے میں وہ کامیاب ہو جائیں تو پھر یہاں اسلامی نظام حیات کے احیاء کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

سیاسی میدان میں اس سازش نے یوں تو مختلف مورچے قائم کر رکھے ہیں مگر اس کا سب سے زبردست مورچہ وہ ہے جہاں سے دینی جماعتوں اور خصوصاً جماعت اسلامی پر ہر وقت گولہ بارود پھینکا جاتا ہے۔ لیاقت علی خاں سے لے کر صدر بھٹو تک یہاں جتنے لوگ بھی برسر اقتدار آئے سب نے اقتدار کی قوت کو بے تحاشا جماعت اسلامی کے خلاف استعمال کیا نشر و اشاعت کے ذرائع اسے عوام میں رسوا اور بدنام کرنے کے لیے کام میں لائے گئے، اس کے ہمدردوں اور ارکان کو ملازمتوں اور رزق کے دوسرے وسائل سے محروم کیا گیا اور اس کے کارکنوں کو متعدد بار جیلوں میں ٹھونسا گیا تاکہ یہ لوگ اپنے مقدس مشن سے دستکش ہو جائیں اور اسلام کی کوئی ایسی صورت گوارا کر لیں جس سے دین حق کا اجتماعی معاملات میں کوئی عمل دخل باقی نہ رہے اور اللہ کا دین مسیحیت کی طرح انسان اور خالق کے درمیان ایک ذاتی تعلق بن کر رہ جائے۔

دوسری طرف اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا کہ ملک میں آمریت کا دور دورہ رہے تاکہ ایک شخص یا ایک محدود سا گروہ عوامی احساسات سے بے نیاز ہو کر جماعت اسلامی اور دوسری خادم دین جماعتوں پر جس طرح چاہے مشق ناز کرتا رہے۔